دینی مدارس کی تاریخ

فقیہ العصر مفتی سید عبدالشکور ترمذیؒ
بانی جامعہ حقانیہ ساہیوال، سرگودھا

حامدًا و مصليًا و مسلمًا : قال النبي ﷺ : إنما بعثت معلماً . ترجمہ: میں تو صرف معلم واستاذ کی حیثیت سے آیا ہوں۔

نبی اکرم ﷺ کے ارشاد بالا سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت اور دنیا میں آپ کی تشریف آوری کا مقصد انسانی دل ودماغ میں ایسی دینی تعلیم کی روشنی پیدا کرنا ہے جس کے ذریعے انسان اپنے مالک حقیقی خداوند عالم کی مرضی کے موافق زندگی بسر کر سکے اور وہ تعلیم انفرادی، اجتماعی، دنیاوی اور اخروی تمام حالات میں اس کی رہنمائی اور ہدایت کر سکے، اسلامی تعلیم کی اس ہمہ گیر جامعیت کے پیش نظر فطری اور طبعی طور پر اسلام میں تعلیم وتعلم (علم سیکھنے اور سکھانے) کو جتنی اہمیت حاصل ہے اتنی کسی مذہب میں نہیں ہے۔ اس اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے اسلام کے ابتدائی دور سے لے کر حکومت اسلامیہ کے ترقی اور عروج کے زمانے تک کے عام مسلمانوں کی اسلامی تعلیم کے ساتھ دلچسپی اور وابستگی کے چیدہ چیدہ مختصر حالات اور امراء اور حکام اسلام کی علوم دینیہ کے اندر سعی اور کوشش کے چند واقعات پر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

عہد رسالت اور مکی زندگی: رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے بعد کی بارہ سالہ مکی زندگی میں صحابہ رضی اللہ عنہم اور مددگاران رسول ﷺ پر اگر چہ رات دن حوادث وافکار کا ہجوم رہتا تھا، لیکن اس آزمائشی دور میں بھی جس قدر پرسکون لمحے مسلمانوں کو مل جاتے تھے ان میں بھی وہ قرآن پاک کی خصوصی تعلیم کا اہتمام کیا کرتے تھے، اس دور کے ایسے تمام مقامات کو جن میں مسلمانوں نے خواہ تھوڑے عرصے کے لئے ہو بیٹھ کر پڑھنے کا انتظام کیا تھا، ہم ان کو ”دینی مدرسہ“ کے

نام سے موسوم کرتے ہیں۔

مدرسہ صحنِ ابی بکر رضی اللہ عنہ: سب سے پہلے جس مقام کو ہم اس دور میں تعلیم کا مرکز کہہ سکتے ہیں، حضرت ابو بکر صدیق ؓ کا وہ چبوترہ ہے جو آپ کے گھر کے سامنے تھا، جس پر آپ نماز وقرآن پڑھا کرتے تھے اور کفار کے لڑکے اور عورتیں آپ کے گرد جمع ہو جاتے اور قرآن کو سنتے تھے، یہ بات کفار کو ناگوار ہوئی اور انہوں نے صدیق اکبر ؓ کو اس چبوترے کے چھوڑنے پر مجبور کیا۔ (بخاری، کتاب بدء الخلق)

مدرسہ دارارقم: مکی زندگی میں خاص ایسی جگہ جس میں مسلمان تعلیم کے لیے بلا روک ٹوک آتے جاتے ہوں اور اس میں طلباء کے لیے کھانے پینے اور خورد ونوش اور قیام کا انتظام ہو، اس پریشانی کے دور میں بظاہر اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا مگر حیرت کی کوئی انتہا نہیں حیرت رہتی جب ہم ارباب تاریخ وسیر کی دارارقم کے متعلق بتائی ہوئی تفصیلات کو دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ یہ مقام کوہِ صفا کے دامن میں تھا، جس میں رسول ﷺ تقریباً چالیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ قیام پذیر تھے، جن میں مرد اور عورتیں سب ہی شامل تھے، اس گھر کے قیام کے زمانے میں حضرت عمر ؓ نے اسلام قبول کیا تھا۔ اس مکان میں نبی اکرم ﷺ مع صحابہ کرام کے قیام پذیر تھے اور باقاعدہ تعلیم وتعلم میں مشغول رہے، حضرت ابو بکر، حضرت حمزہ، حضرت علی رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ اس مکان میں رہتے تھے اور رسول ﷺ سے ان کا تعلیمی مشغلہ جاری تھا۔ اس مدرسہ دارارقم کے نظام پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیان سے بھی روشنی پڑتی ہے، ان کے فرمان کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

"مسلمان ہونے والوں کو ایک ایک دو دو کر کے رسول ﷺ کسی صاحب حیثیت کے پاس بھیج دیتے تھے اور یہ لوگ اس کے پاس رہ کر کھانا کھاتے تھے، چنانچہ میرے بہنوئی کے گھر بھی دو آدمی موجود تھے، ایک خباب بن ارت تھے، خباب میرے بہنوئی اور بہن کے پاس جا جا کر قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ یہ مدرسہ دارارقم حضرت عثمان بن ارقم کے مکان میں تھا، یہ مکان اس زمانے میں دارارقم کے بجائے اسلام کا مرکزی تعلیمی مقام ہونے کی وجہ سے دارالاسلام کے نام سے مشہور ہو گیا تھا"۔ (سیرت حلبیہ)

اسلام کے ابتدائی دور کے اس مختصر مدرسے کا نظام ناظرین کرام کے سامنے ہے کہ:

(۱)......طلباء کی تعداد چالیس کے لگ بھگ تھی۔

(۲)......یہی جگہ پڑھنے کی بھی تھی اور رہائش کی بھی۔

(۳)......طعام کا انتظام یہ تھا کہ طلباء مال دار صحابہ کے گھروں پر بطور وظیفہ کے کھانا کھایا کرتے تھے۔

اس ابتلاء وآزمائش کے زمانہ میں تعلیم کے اس قدر انتظام اور اہتمام سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام میں تعلیمی مراکز اور مدارس دینیہ کے قیام کی کتنی ضرورت واہمیت ہے۔

مدرسہ شعب ابی طالب و مدرسہ بیت فاطمہ: اس کے علاوہ مکہ معظمہ میں ہجرت سے قبل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہنوئی اور بہن کے مکان پر خباب بن ارت کے قرآن پڑھانے کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ نیز "مدرسہ بیت فاطمہ اور مدرسہ شعب ابی طالب" (جس میں نبی اکرم ﷺ نے مع اپنے ساتھیوں کے ۷ نبوی سے لے کر ۱۰ نبوی تک قریش مکہ کے لمانہ مقاطعہ کرنے کی وجہ سے تین سال کا زمانہ اسارت گزارا ہے) میں بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا، اس کے نتیجے میں سلائے مکہ کی ایک جماعت تیار ہوگئی اور دوسرے، مقامات پر بھی وہ تعلیمی کام کرنے لگے۔

مدرسہ حبشہ: جب کفار کے ظلم و ستم سے تنگ آکر بعض صحابہ کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی تو انہوں نے وہاں بھی علیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھا، اس کو "مدرسہ ارضِ حبشہ" کے نام سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

مدنی زندگی: حضور ﷺ نے اپنی ہجرت سے بھی پہلے تعلیم دینے کے لیے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ روانہ فرمایا، انہوں نے سعد بن ضرارہ کے مکان پر قرآن کا باقاعدہ سلسلہ جاری فرمایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معدودے چند کے علاوہ تقریباً تمام انصار مدینہ مسلمان ہوگئے اور اپنے بت توڑ دیے اور جب مصعب بن عمیر مدینے سے لوٹ کر رسول ﷺ کے پاس آئے تو ان کا خطاب مقرئ یعنی معلم پڑ چکا تھا۔ (جمع الفوائد)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے پہلے مقرئ (استاد) کا لقب حضرت مصعب کے نصیب میں تھا جس سے وہ معزز ہوئے اور انصار مدینہ کی مسجد بنی زریق میں حضرت رافع بن مالک رضی اللہ عنہ اور مسجد بنی بیاضہ میں حضرت سعد بن ضرارہ رضی اللہ عنہ پڑھایا کرتے تھے اور دار سعد بن خیثمہ نیز بنونجار، بنو عبدالاشہل، بنوظفر اور بنوعمرو بن عوف وغیرہم کے محلوں میں حضور ﷺ کی ہجرت سے پہلے ہی تعلیمی مراکز اور مدارس قائم ہو چکے تھے۔

مدرسہ قبا: مدرسہ قبا کا تو ایک مستقل نظام تھا، جو حضور ﷺ کی ہجرت سے پہلے ہی قائم ہو چکا تھا، کیوں کہ حضور ﷺ کی مدینہ منورہ میں تشریف آوری سے پہلے ہی صحابہ کرام کی ہجرت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور مہاجرین عموماً قبا میں ہی قیام پذیر ہوتے تھے۔

مدرسہ صفہ: رسول اکرم ﷺ کے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد مسجد نبوی کی بنیاد رکھی گئی اور حجرہ شریفہ کی پشت پر جانب شمال بابِ جبرئیل اور باب النساء کے درمیان ایک وسیع چبوترہ "دکۃ الاغوات" کے نام سے موسوم تھا اس پر جو حضرات فروکش ہوتے تھے وہ "اصحابِ صفہ" کہلاتے تھے اور یہی چبوترہ کبھی اصحاب صفہ کا "صفہ" تھا، یہاں پر طلبہ کا ہجوم رہتا، بعض اوقات سینکڑوں کی تعداد ہو جاتی، تمام اصحابِ صفہ کی مجموعی تعداد چار سو تک پہنچتی ہے، مختلف اوقات میں اس صفہ کے طلبہ کی تعداد ستر، اسی تک پہنچ جاتی تھی۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یہ کام سپرد تھا کہ جو امداد اصحاب ثروت کی طرف سے ان طلباء کے لیے آئے تو ان کی حفاظت کریں اور بحصہ مساوی تقسیم کریں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ذمہ طعام کا انتظام ہوتا تھا۔ کھانے کے سلسلے میں ایسا ہوتا تھا کہ کھجوروں کے گچھے مال دار صحابہ بھیج دیا کرتے تھے اور

بعض مال دار صحابہ ان کو اپنے ساتھ لے جاتے اور انہیں کھانا کھلا دیتے تھے، ان میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نہایت فیاضی سے کام لیتے تھے حتیٰ کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اسی اسی طلبہ ان کے گھر جا کر کھانا کھاتے تھے۔ (زرقانی)

جامعہ صفہ کے فاضلین قراء کہلاتے تھے۔ یہیں کے طلباء نے دنیا میں اسلام کے علوم کو پھیلایا اور وہی حضرات تعلیمی خدمات کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ عہد رسالت میں جامعہ صفہ کے علاوہ مدینہ منورہ کے اندر دوسرے مدارس کا ذکر بھی علامہ سمہودی نے کیا ہے، بعض کا ذکر اوپر اجمالاً ہو چکا ہے۔

عہد خلافت راشدہ: عہد رسالت کے بعد خصوصیت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں حجاز اور ہر اسلامی آبادی میں قرآن مجید کی تعلیم کے لیے مستقل حلقے اور مکاتیب قائم فرمائے، حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو دمشق میں شام کی جامع مسجد میں قرآن پاک کی تعلیم کے لیے مقرر فرمایا، ایک مرتبہ طلباء کا شمار کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ سولہ سو (1600) طالب علم ان کے حلقہ درس میں شریک ہیں۔ (طبقات القراء للذہبی:۲۰۶)

قرآن مجید کے ساتھ حضرت عمرؓ نے درس حدیث کے حلقے قائم فرمائے، اس کام کے لیے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو ایک گروہ کے ساتھ کوفہ اور معقل بن یسار، عبداللہ بن معقل اور عمران بن حصین کو بصرہ اور عبادہ بن صامت اور ابو درداء رضی اللہ عنہما کو شام میں مقرر فرمایا اور لوگوں کو تاکید کی کہ ان سے علم حدیث کی تحصیل کریں۔ (ازالۃ الخفاء)

علامہ ابن الجوزیؒ نے سیرۃ العمرین میں لکھا ہے کہ حضرت عمر نے جو مکاتیب قائم کیے تھے، ان میں معلمین کی تنخواہیں مقرر تھیں اور ہر ہر معلم کو پندرہ پندرہ درہم بیت المال سے ملتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں ان مدارس کو اور زیادہ وسعت ہوئی اور تمام ممالک مفتوحہ میں جابجا مکاتب اور مدارس قائم ہو گئے۔

عہدِ خلفاء وامراء اسلام:

عہد رسالت اور خلافت راشدہ کے بعد اسلامی آبادی اور فتوحات میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیمی مکاتب میں بھی ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ خلفاء وامراء اور اربابِ ثروت نے اپنے گھروں میں بھی تعلیمی انتظام کیا اور کوئی قابل ذکر اسلامی آبادی ایسی نہیں ملتی جس میں درس وتدریس کا انتظام نہ ہو، تعلیم مفت ہوتی تھی، غریب طلبہ کے کھانے پینے اور لکھنے پڑھنے کی ضروریات بغیر کسی معاوضے کے پوری ہوتی تھیں۔

عہد قدیم کے علمی حلقوں کی اب صرف دو علمی یادگاریں باقی ہیں: پہلی تیونس کی جامع زیتون ہے جو تیسری صدی ہجری میں قائم ہوئی، یہ درس گاہ اس زمانے کے عام طرز کے مطابق تیونس کی جامع اعظم میں قائم ہے اور شروع سے اب تک خاص عظمت وشہادت کی مالک ہے۔

دوسری یادگار مصر کی جامع ازہر ہے، یہ عظیم الشان جامع مسجد فاطمی سلاطینِ مصر کے زمانہ کی یادگار ہے، جامع ازہر کی تکمیل 361ھ میں ہوئی ہے مگر اس کی علمی زندگی کی ابتداء چوتھی صدی اواخر سے ہوئی ہے۔ مسجد کا وسیع صحن ہے اور

اندرونی حصہ قدیم طرز کے علمی حلقوں کی درس گاہوں کے طور پر کام آتا ہے۔ جامع ازہر اسلامی دنیا کی سب سے بڑی اور قدیم یونی ورسٹی ہے، جو ایک ہزار سال سے جاری ہے اور آج جب کہ تقریباً تمام قدیمی مدارس صفحۂ ہستی سے محو ہو چکے ہیں، یہ یونی ورسٹی اسی قدیم شان وشوکت کے ساتھ باقی ہے، دس پندرہ ہزار طلباء اس کے اندر تعلیم حاصل کرنے والے اور سینکڑوں اساتذہ اس میں تعلیم دینے کے لیے موجود رہتے ہیں۔

جامع ازہر کے مصارف واخراجات کے لیے مصر کے مختلف سلاطین نے جو جاگیریں وقف کی ہیں ان کی سالانہ آمدنی لاکھوں پونڈ ہے، ابھی قریبی زمانہ میں دوسری جنگ عظیم سے کچھ پہلے کی بات ہے کہ مصر کے سابق شاہ فاروق نے اپنی جیبِ خاص سے ساٹھ ہزار مصری پونڈ جامع ازہر کو عطیہ کیے تھے۔ حکومت کی سرپرستی اور اوقاف کی آمدنی کی بدولت آج بھی یہ جامع ازہر اپنے اقتدار اور عظمت کے لحاظ سے اس درجہ اونچا اور بلند ہے کہ شیخ الازہر کے منصب کو مصر کی وزارت عظمیٰ سے بڑھ کر سمجھا جاتا ہے۔

علامہ مقریزی نے لکھا ہے کہ ''مدرسے کے بانی اول اہل نیشاپور ہیں، جہاں سب سے پہلے مدرسہ بیہقیہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ (۲/۳۶۲)۔ تاریخ فرشتہ میں ہے کہ ''۴۱۰ھ میں سلطان محمود غزنویؒ نے اپنے پایہ تخت غزنی میں ایک جامع مسجد عروس الفلک کے نام سے تعمیر کرائی اور اس کے ساتھ ایک عظیم الشان مدرسہ بھی تعمیر کرایا تھا، مدرسے کے ساتھ کتب خانہ بھی تھا جو نادرالوجود کتابوں کے ساتھ معمور تھا، مسجد ومدرسہ کے اخراجات کے لئے سلطان نے بہت سے دیہات کی آمدنی وقف کی تھی''۔

سلطان محمود کی اس مثال سے تھوڑے ہی دنوں میں غزنی کے اطراف وجنوب میں بے شمار مدارس قائم ہو گئے اور سلطان کے فرزند سلطان مسعود نے تو اپنے عہد سلطنت میں اس کثرت سے مدرسے قائم کیے کہ تاریخ فرشتہ کے بیان کے مطابق زبان ان کے شمار کرنے سے عاجز وقاصر ہے۔ اسی زمانے میں ابن خلکان کی روایت کے مطابق علامہ ابو اسحاق اسفرائنی (المتوفی ۴۱۸ھ) کے لیے نیشاپور میں ایک مدرسہ قائم ہوا۔

ان مدارس کے قیام کے کچھ عرصہ بعد دولت سلجوقیہ کے علم دوست وزیر نظام الملک طوسی (متوفی ۴۸۵ھ) نے نیشاپور اور بغداد میں دو دارالعلوم قائم کیے، جن کو تاریخ کے اوراق میں ''نظامیہ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس دارالعلوم کے لئے جو بغداد میں ۴۵۹ھ میں قائم ہوا تھا چھ لاکھ دینار (تیس لاکھ روپے) کی گرانقدر رقم شاہی خزانے سے مقرر تھی اور نظام الملک نے خود اپنی جاگیر کا دسواں حصہ اس کے لیے وقف کر دیا تھا، طلباء کے لئے وظائف کا انتظام کیا گیا اور اساتذہ کے لیے بیش قرار مشاہرے مقرر کیے گئے۔

نظام الملک نے نہ صرف نیشاپور میں اور بغداد میں ہی دارالعلوم قائم کیے بل کہ اس نے حکم دے دیا کہ ملک میں جس جگہ بھی کوئی ممتاز عالم موجود ہو وہاں اس کے لئے ایک مدرسہ اور مدرسہ کے ساتھ ایک کتب خانہ تعمیر کر دیا جائے، چنانچہ

اس زمانے میں ہزاروں مدارس اور کتب خانے قائم ہوئے، اس سے قبل سلطان محمود غزنوی اور اس کے بیٹے سلطان مسعود غزنوی نے اپنے اپنے عہد میں بکثرت مدارس قائم کیے تھے، نظامیہ کے قیام سے قبل بھی اس نیشاپور میں سعدیہ اور بیہقیہ نام کے دو بڑے دار العلوم موجود تھے۔ سعدیہ سلطان محمود غزنوی کے بھائی امیر نصر نے قائم کیا تھا، امام الحرمین (امام غزالیؒ کے استاد) نے بیہقیہ میں تعلیم پائی تھی، جب نظامیہ قائم ہوا تو امام الحرمین کو اس کا صدر بنا دیا گیا۔

امام غزالیؒ جیسے یکتائے زمانہ نظامیہ کے خوشہ چینوں میں ہیں۔ نظامیہ کے علاوہ بغداد میں تیس اور بڑے دار العلوم قائم تھے، جن کے متعلق علامہ ابن جریرؒ نے لکھا ہے کہ "ہر مدرسہ بجائے خود ایک مستقل آبادی معلوم ہوتا تھا"۔ نظام الملک کے بعد خلیفہ مستنصر باللہ عباسی نے بغداد میں ۶۳۱ھ میں ایک دار العلوم المستنصریہ کے نام سے قائم کیا۔ طلباء کے قیام وطعام، کاغذ، قلم، دوات وغیرہ اشیاء بھی مدرسے سے ملتی تھیں، اس کے علاوہ ایک دینار (تقریباً 5 روپے) ہر طالبعلم کو ماہانہ وظیفہ ملتا تھا، خلیفہ مستنصر باللہ نے ان مصارف کے لئے جو وقف کیا تھا اس کی آمدنی آج کل کے حساب سے چار لاکھ روپے سالانہ بنتی ہے۔

ہندوستان:

ہندوستان میں اسلامی حکومت کا مستقل قیام ساتویں صدی ہجری کے شروع میں قطب الدین ایبک (۶۰۲ھ/۶۰۶ھ) سے شروع ہوتا ہے، اس پر بمشکل ایک صدی گذری تھی کہ ہندوستان علوم وفنون کا گہوارہ بن چکا تھا۔

علامہ مقریزی نے کتاب الخطط میں سلطان محمد تغلق کے زمانے کے دہلی کی نسبت لکھا ہے کہ "سلطان محمد تغلق کے عہد میں دہلی کے اندر ایک ہزار اسلامی مدارس قائم تھے، جن میں مدرسین کے لئے شاہی خزانے سے تنخواہیں مقرر تھیں، تعلیم اس قدر عام تھی کہ کنیزیں تک حافظ قرآن اور عالمہ ہوتی تھیں"۔

فیروز شاہ تغلق کے تعمیر کرائے ہوئے مدرسہ فیروز شاہی کے متعلق ضیاء برنی نے لکھا ہے: "مدرسہ کی عمارت نہایت وسیع ہے اور ایک بہت بڑے باغ کے اندر تالاب کے کنارے پر واقع ہے، ہر وقت سینکڑوں طلبہ، علماء وفضلاء یہاں موجود رہتے ہیں، باغ کے کنجوں میں سنگ مرمر کے فرش پر نہایت آزادی کے ساتھ علمی مشاغل میں منہمک نظر آتے ہیں"۔

عالم گیر اورنگ زیب کے عہد کے متعلق ایک سیاح نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے: "سندھ کے مشہور شہر ٹھٹھہ میں مختلف علوم وفنون کے چار سو مدارس قائم تھے"۔

حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ فرماتے ہیں کہ "نواب نجیب الدولہ کی سرکار سے نو سو علماء کو وظائف ملتے تھے" (ملفوظات)۔ روہیل کھنڈ جیسے غیر معروف خطے میں پانچ ہزار علماء مختلف مدارس میں درس دیتے تھے اور حافظ رحمت اللہ خان کی ریاست سے تنخواہ پاتے تھے۔

مختصر یہ کہ ہر زمانے میں مسلمانوں نے علم کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور سلاطین وامراء بھی علمی فیاضی اور علماء و

طلباء کی خدمت کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کو نجات اخروی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ سلاطین و امراء کی طرف سے علماء و طلباء کے لئے جائیدادیں وقف تھیں، ان کی آمدنی ان کے خورد و نوش اور تعلیمی مصارف کے لیے کفیل تھی، اس طرح ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک تمام تعلیم عام اور مفت ہوتی تھی اور علماء و طلباء بھی اپنے اپنے متعلقین کے لئے کسب معاش سے مطمئن ہو کر فراغت و سکونِ خاطر کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے، نہ تو منتظمین مدارس کو چندوں کی اپیل کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی نہ ہی طلباء کو دست نگر سمجھ کر طالب علمی کو عزت نفس کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے آنے سے پہلے تک یہی نظام تعلیم جاری تھا، دہلی، آگرہ، لاہور، ملتان، جونپور، لکھنؤ، خیر آباد، پٹنہ، اجمیر، سورت، دکن، مدراس، بنگال اور گجرات وغیرہ کے بہت سے مقامات علم و فن کے مرکز تھے۔ صرف ایک صوبہ بنگال کے متعلق ایک انگریز مصنف کیری ہارڈی نے ”میکس مولر“ کے حوالے سے یہ کیفیت بیان کی ہے: ”انگریزی عمل داری سے قبل بنگال میں اسی ہزار مدارس تھے، اس طرح چار سو آدمیوں پر ایک مدرسہ کا اوسط نکلتا تھا، اسی صوبہ بنگال میں سلاطین و امراء نے مدارس کے لیے جو جائیدادیں وقف کی تھیں ان اوقاف کا مجموعی رقبہ مسٹر جیمز گرانٹ کے مطابق بنگال کے چوتھائی رقبہ سے کم نہ تھا، اوقاف کے علاوہ سلاطین و امراء نقد وظائف کے ذریعہ سے اہل علم کی اعانت کرتے تھے۔

مدارس اور درس گاہوں کا ملک میں پھیلا ہوا یہ عظیم الشان سلسلہ کیوں کر ٹوٹا اور یہ مدارس و مکاتب کیوں تباہ ہو گئے، اس سوال کے جواب کے لیے بارہویں صدی ہجری اور اٹھارویں صدی عیسوی کی ہندوستانی سیاسی تاریخ کا جاننا ضروری ہے۔

ہندوستانی سیاسی تاریخ:

ایسٹ انڈیا کمپنی جو ابتدا میں صرف تجارتی اغراض و مقاصد لے کر ہندوستان میں داخل ہوئی تھی، ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی مشہور جنگ نے اس کو ایک نئی اور زبردست طاقت میں بدل دیا، یہ نئی طاقت جس زمانے میں ظہور پذیر ہوئی اس وقت بدقسمتی سے مرکزی طاقت پارہ پارہ ہو چکی تھی اور ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا، ہندوستان کی اس سیاسی کمزوری سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور وہ آہستہ آہستہ اپنی دسیسہ کاریوں اور ریشہ دوانیوں سے ملک پر قابض ہوتی چلی گئی تا آنکہ انیسویں صدی کے اوائل تک پنجاب کے علاوہ پورے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کر لیا، پرانے قانون اور قدیم نظام تعلیم و تہذیب کو منسوخ کر دیا، جن قدیم مصارف کے لیے سلاطین و امراء نے طویل مدت سے بڑے بڑے اوقاف مقرر کیے تھے (جن کی کچھ تفصیل اوراقِ گذشتہ میں گزر چکی ہے) کمپنی کی حکومت نے ان تمام اوقاف کو ۱۸۳۸ء میں ضبط کر لیا۔ وظائف حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ہی موقوف ہو چکے تھے، اس وقت تعلیم کا تمام تر دار و مدار ان

ہی اوقاف پر تھا جو اس مقصد کے لئے مخصوص کیے گئے تھے۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے جو بنگال میں ایک بڑے سول عہدے پر فائز تھا ۱۸۷۱ء میں ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' نامی کتاب لکھ کر اس سلسلے کے تاریخی حقائق کو سرکاری کاغذات سے واشگاف کیا ہے۔ ہنٹر لکھتا ہے کہ ''صوبۂ بنگال پر جب ہم نے قبضہ کیا تو اس وقت کے قابل ترین افسر مال جیمز گرانٹ کا بیان ہے کہ اس وقت صوبے کی آمدنی کا تخمیناً ایک چوتھائی حصہ جو معافیات کا تھا حکومت کے ہاتھ میں نہیں تھا''۔

۱۷۷۲ء وارن ہیسٹنگز نے اور ۱۷۹۲ء میں لارڈ کالونواس نے معافیات کی واپسی کی مہم شروع کی مگر ناکامی رہی۔ ۱۸۱۵ء میں حکومت نے اس معاملے کو زور سے اٹھایا مگر عمل کی جرأت نہ ہوسکی، آخر ۱۸۳۸ء میں آٹھ لاکھ پونڈ کے خرچ سے مقدمات چلا کر ان معافیات اور اوقاف پر حکومت نے قبضہ پالیا۔ صرف ان معافیات کی آمدنی سے حکومت کی آمدنی میں تین لاکھ پونڈ یعنی تقریباً ۴۵ لاکھ روپے کا اضافہ ہوگیا۔ اس کاروائی کا مسلمانوں کی علمی زندگی پر کیا اثر پڑا اس کی نسبت ہنٹر لکھتا ہے: ''سینکڑوں پرانے خاندان تباہ ہوگئے اور مسلمانوں کا تعلیمی نظام جس کا دارومدار ان ہی معافیات پر تھا تہہ و بالا ہوگیا، مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اٹھارہ سال کی مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے''۔

اندازہ کیجیے کہ جب ایک دور افتادہ صوبے بنگال میں جس کو اس زمانہ کے لحاظ سے کوئی خاص تعلیمی فوقیت اور مرکزیت حاصل نہ تھی تعلیمی اخراجات کی آمدنی کے لیے ۴۵ لاکھ روپے سالانہ آمدنی کے اوقاف میں موجود تھے تو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بالخصوص ان مقامات میں جن کو تعلیمی مرکزیت اور تفوق حاصل تھا کس قدر اوقاف ہوں گے۔

اوقاف کی ضبطی نے مسلمانوں کے تعلیمی نظام پر ایک ضرب کاری کا کام کیا، علماء اور اساتذہ جو اب تک ان ہی اوقاف کی آمدنی کی بدولت فکر معاش سے مطمئن اور بے فکر ہوکر درس و تدریس میں مصروف تھے وہ منتشر اور پراگندہ ہوگئے، مدارس اور درس گاہوں میں سناٹا چھا گیا، چنانچہ برک اپنی اس یادداشت میں جو برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کی گئی تھی لکھتا ہے: ''ان مقامات میں جہاں علم کا چرچا تھا اور جہاں دور دور سے طالب علم پڑھنے کے لئے آتے تھے آج وہاں علم کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا''۔

مگر ان حوادثاتِ زمانہ اور گردشِ ایام کے باوجود بھی ہندوستان میں کچھ ایسے سخت جان علماء موجود تھے جن کا علمی فیضان کسی مالی اعانت و امداد کا چنداں محتاج نہ تھا۔ دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ کا خاندان اور لکھنؤ میں ملا نظام الدین کا گھرانہ اور خیر آباد کا مشہور علمی خانوادہ سینکڑوں میں چند ممتاز مثالیں ہیں، ایسے حضرات ہر قسم کے حوادثات و مصائب کو برداشت کر کے اپنے کام میں مصروف اور علمی خدمت میں ہمہ تن لگے ہوئے تھے کہ ۱۸۵۷ء کی دارو گیر کا قیامت خیز ہنگامہ پیش آگیا، گنے چنے علماء جو باقی رہ گئے تھے ان پر برطانوی حکومت نے بغاوت کا جرم عائد کردیا، ان میں سے بعض کو پھانسی دی گئی، بعض کالے پانی بھیج دیے گئے اور کسی کو جلا وطن کردیا گیا، جو بچے ان میں سے

اکثر ممالک اسلامیہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی رحمہ اللہ جو اس وقت ولی اللہی مسندِ علم کے جانشین تھے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے۔ ۱۸۳۸ء میں اوقاف کی ضبطی نے جو قدیم مدارس کو عظیم نقصان پہنچایا تھا انیس سال کے بعد ۱۸۵۷ء کے حادثے نے اس کی تکمیل کر دی، اب رہا سہا تعلیمی نظام بھی درہم برہم ہو گیا۔

قدیم مدارس اور مذہبی تعلیم کے ذرائع آمدنی اور اس کے متعلقہ لاکھوں روپیوں کے ان اوقاف کے تباہ اور برباد کرنے کے علاوہ (جن پر مذہبی تعلیم کا دارومدار تھا) کمپنی کی حکومت کے ۱۸۱۳ء کے ایک قانون کے ذریعہ یورپ کے پادریوں کو ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کے لیے مشن اسکول کھولنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ پادریوں کی سرگرمیاں جاری تھیں، مشن اسکول کھولے جا رہے تھے جن میں حصولِ تعلیم کے لئے سہولتیں مہیاں کی جا رہی تھیں، کمپنی کے حکام پشت پناہ تھے اور ہر قسم کی امداد واعانت بہم پہنچاتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ملازمتوں کا لالچ تھا۔ دوسری طرف کمپنی کی اسکیم یہ تھی کہ ہندوستان کے بسنے والوں خصوصاً مسلمانوں کو مفلس بنا کر اور ملازمتوں کے حصول کی ترغیب دلا کر مشن اسکول میں تعلیم دلانے میں مجبور کر دیا جائے جو اس وقت عیسائیت کی تبلیغ کے لیے سب سے بڑے ذریعے سمجھے جاتے تھے، اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹیں مسلمانوں کے علوم اور ان کا دینی شعور اور مذہبی شغف تھا۔

اس لئے ۱۸۳۵ء کا تعلیمی نظام مرتب کیا گیا جس کی روح لارڈ میکالے (جو کہ ۱۸۳۵ء کی تعلیمی کمیٹی کا صدر تھا) کے نزدیک یہ ہے، وہ لکھتا ہے: "ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہمارے اور ہماری رعایا کے درمیان مترجم کا کام دے سکے اور ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو، مگر مذاق، رائے اور الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو"۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کمپنی کی یہ اسکیم اور اس کا یہ نظام تعلیم مسلمانوں کی مذہبی زندگی، قومی روایات اور علوم وفنون کے لئے سخت تباہ کن اور مہلک ترین حربہ تھا، اسی دوران ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ پیش آ گیا جس کی بے پناہ تباہ کاریوں اور ہولناکیوں نے دلوں کو ہیبت زدہ، دماغوں کو ماؤف اور روحوں کو پژمردہ اور پوری قوم کو مفلوج کر دیا، حالت یہ ہو گئی تھی کہ مسلمانوں کو ذرائع معاش سے یکسر محروم کر دیا گیا، تعلیم سے بے رغبتی اور مذہب سے بیگانگی میں روز افزوں ترقی اور اضافہ ہو رہا تھا اور یہ وقت قریب تھا کہ علماء کی وہ نسل جو سابقہ درس گاہوں کی تعلیم یافتہ اور مذہبی شعور واحساس اپنے اندر رکھتی تھی رفتہ رفتہ ختم ہو جائے، ایسے حالات تھے جس کی وجہ سے ملک کے ارباب علم وفضل نے یہ محسوس کیا کہ سیاسی زوال وانحطاط اور حکومت سے محرومی کے ساتھ ساتھ اب مستقبل میں مسلمانوں کا علم، مذہب اور قومی زندگی بھی سخت خطرے میں ہے، ان کی دور بین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ فاتح قوم کے اثرات اور اس کے خصائص مفتوح قوم کے دل، دماغ اور علم وفکر پر اثر انداز ہو کر اس کے ملّی شعائر، قومی خصائص اور فکر وعمل کی صلاحیتوں کو مٹا کر رکھ دیں گے، جس کا

لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اسلامی روایات اور اسلامی طور وطریقہ سے نفرت کرنے لگے گی اور اس کے لیے صرف فاتح قوم کی نقالی اور کورانہ تقلید واتباع ہی سرمایہ افتخار واعزاز بن کر رہ جائے گی، اس وقت مذہبی تعلیم کے سوا اور کوئی چیز فائدہ منداور کارگر نہیں تھی جس سے اس خطرہ کا سدباب ہو سکے، یہی ایک ایسی چیز تھی جس کے ذریعے سے مسلمان اپنے مذہبی شعائر اور قومی خصائص کا تحفظ کر سکتے تھے اور مغلوب ومحکوم ہونے کے باجود وہ بحیثیت مسلمان قوم کے زندہ رہ سکتے تھے، اسی لیے اس وقت علمائے کرام اور مذہبی رہنماؤں نے گردوپیش کے غیر مساعد حالات اور زمانے کے دنیاوی تقاضوں سے بے نیاز ہو کر فاتح قوم کے ارادوں اور اسکیموں کے علی الرغم مسلمانوں کو اسلامی علوم وفنون کی تعلیم کی طرف توجہ دلائی، جس کے ذریعے ان میں آئندہ مذہبی شعور کو برقرار رکھا جاسکتا تھا اور اس کے لیے قدیم مذہبی مدارس کی نشاۃِ ثانیہ کو ضروری سمجھا گیا اور اس مقصد کے لیے مدارس عربیہ قائم کیے گئے۔

مدارس عربیہ کی نشاۃ ثانیہ کا یہ کام ایسے ماحول اور دور میں شروع ہوا جب کہ قومِ مسلم بحیثیت قوم مفلس و نادار اور حکومتِ متسلطہ کی دست نگر تھی اور وہ تمام اوقاف وغیرہ پہلے ہی ضبط کر لیے گئے تھے جن پر دینی تعلیم کی کفالت کا مدار تھا، اسی مفلسی وناداری سے متاثر ہو کر بعض ہمدردانِ قوم نے محض دنیوی خیر خواہی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حکومت متسلطہ کی زبان اور علوم وفنون کے پڑھنے کو ضروری سمجھا تا کہ اس کے ذریعے سے ملک میں منصب وعہدے بھی حاصل کیے جاسکیں اور اس سے معاشی ضروریات بھی پوری کی جاسکیں، اسی لیے انہوں نے لارڈ میکالے کی تجویز کردہ تعلیمی اسکیم کی ہم نوائی کرتے ہوئے ایسے اسکولوں اور کالجوں کی طرف رخ کیا جن کی ڈگریوں اور سرٹیفکٹوں کے حصول پر ہی ملازمتوں اور عہدوں کے ملنے کا مدار تھا، مگر اس کس مپرسی، بے بسی اور بے سروسامانی کی حالت میں بعض اہل دل اللہ والوں کے قلوب میں مدارس دینیہ کے احیاء کا داعیہ پیدا ہوا اور ایک مردحق آگاہ اور درویشِ کامل عالمِ ربانی حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ نے ۱۸۶۷ء میں توکلاً علی اللہ دیوبند ضلع سہارنپور کی تاریخی مسجد چھتہ میں دارالعلوم کی بنیاد رکھ دی اور تعلیم وتبلیغ نبوی کا نظام پھر سے قائم کردیا۔

الحمدللہ! ایک مسجد میں شروع ہونے والا یہ دارالعلوم بہت جلد دنیا کی ایک بہت بڑی دینی درس گاہ بن گئی اور دور دراز ممالک اور ہندوستان کے گوشے گوشے سے نہ صرف یہ کہ لوگ جوق در جوق علوم دینیہ کے حاصل کرنے لیے یہاں جمع ہونے لگے بل کہ ملک کے کونے کونے، شہر شہر، قریہ قریہ اس کی شاخیں قائم ہو گئیں اور شجر طوبیٰ کی شاخوں کی طرح ہر طرف پھیل گئیں۔ اس دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل حضرات میں سے بہت سے حضرات آسمان علم پر مہر و ماہ کی طرح چمکے، جیسے: حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب، شیخ المحدثین مولانا خلیل احمد سہارنپوری صاحب، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً وغیرہم۔

ان میں سے صرف حضرت تھانوی کی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پرانے قصبہ تھانہ بھون کی پرانی مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھ کر اس زندہ دل درویش نے اصلاحِ امت کے لیے تعلیمی اور تبلیغی کتنا عظیم الشان کام کیا ہے۔ حضرت والا کی تقریباً نوسو(۹۰۰) تصانیف، تالیفات، مواعظ وملفوظات کے اوراق کو زندگی کے ایام پر پھیلایا جائے تو اوراق کی تعداد ایامِ زندگی سے بڑھ جاتی ہے۔

ہندوستان میں ان دینی مدارس سے کیسے کیسے علمائے حق پیدا ہوئے اور انہوں نے مذہب وملک کی کیا کیا گراں قدر خدمات انجام دیں یہ ہمارے موضوع میں داخل نہیں، اس وقت صرف اتنی بات عرض کردینا ضروری سمجھا گیا کہ علمائے حق نے یہ دینی مدارس ایسے وقت میں قائم کیے جس وقت ان مدارس کے نظامِ تعلیم وتبلیغ کو نہ کسی حکومت کی سرپرستی حاصل تھی اور نہ قومی خزانے کی پشت پناہی اور نہ ہی ملک کے لاکھوں روپیوں کی اوقاف کی آمدنی سے ان کو امداد حاصل ہوتی تھی، بل کہ یہ نظام بظاہر صرف ملک کے دینی شعور واحساس رکھنے والے اہلِ خیر کی مالی امداد وتعاون اور چندے کے موجودہ طریقے پر چل رہا تھا اور درحقیقت بے سروسامانی اور محض اللہ کے بھروسے پر اس نظام کی بنیاد تھی، غرض یہ کہ چندے کے موجودہ طریقے کی بنیاد پر مدارس دینیہ کا قیام کیا گیا اور ملک میں جابجا مدارس قائم کردیے گئے، اس وقت سے یہ نظام مدارس کے لیے جاری ہوگیا۔

علماء نے قوم کے سامنے دستِ سوال دراز کیا، مدارس کے لیے چندے مانگے، ہر طرح کے طعنے سنے، کئی قسم کے اعتراضات برداشت کیے مگر تعلیمِ مذہب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور فاتح قوم انگریز کے منصوبے کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ مدارس نے نہ صرف یہ کہ کمپنی کی تجویز کردہ لامذہب بنانے والی مذکورہ تباہ کن اسکیم اور مہلک ترین حربے کی زد سے علم و مذہب کو بچالیا اور عیسائیت کے تیز وتند طوفان اور بڑھتے ہوئے سیلاب عظیم کی لپیٹ سے ملک کو محفوظ کرلیا، بل کہ مسلمانوں کو بحیثیت قومِ مسلم کے مٹنے اور ختم ہونے سے بھی بچالیا، ورنہ یہ نظامِ تعلیم اور مشن اسکول اور عیسائیت کی اشاعت کے لیے پادریوں کی سرگرمیاں جس کے پیچھے حکومتِ وقت کی بے پناہ قوت کام کررہی تھی، ہندوستان کے مسلمانوں کو اسی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیتے اور ہندوستان کے مسلمانوں کا وہی حال ہوتا جو اسپین کے مسلمانوں کا ہو چکا تھا کہ وہاں کی عیسائی حکومت کی بدولت وہاں کے تمام باشندے عیسائی ہوچکے تھے (نعوذ باللہ منہ)۔

ان مدارس کا ملت ومذہب اور قومِ مسلم کو اغیار کے حملوں سے بچالینا ہی کیا ایسا ناقابلِ معافی عظیم جرم ہے کہ جس کی پاداش میں سب سے بڑی اسلامی سلطنت پاکستان کے بسنے والے بعض طبقے یہ کہتے نہیں تھکتے کہ تعلیمِ جدید کے اس دور میں دینی مدارس کا کیا فائدہ ہے اور ان پر قوم کی دولت اور وقت کیوں ضائع کیا جارہا ہے؟

قوم کے ان بہی خواہوں اور ہمدردوں سے یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ اگر ان مدارس کا قیام نہ کیا جاتا اور لارڈ میکالے کا مرتب کردہ نظامِ تعلیم اور عیسائیت کی تبلیغ کے لیے حکومتِ متسلطہ کی مساعی کے سامنے علمائے حق بھی گھٹنے ٹیک دیتے اور

بڑے بڑے منصوبوں، عہدوں اور تنخواہوں کے لالچ میں آکر انگریزی اسکولوں اور کالجوں کا رُخ کر لیتے تو کیا ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی دور کے تقریباً سو سالہ زمانہ میں مذہب کے تحفظ اور اس کے بقاء کی کوئی صورت باقی رہ گئی تھی۔

غور فرمایا جائے کہ جب مذہب ہی باقی نہ رہتا اور مسلمانوں کو بحیثیت قوم مسلم کے ختم کر کے عیسائیت اور لادینیت میں جذب کر لیا جاتا تو پھر پاکستان کا مطالبہ کرنے اور اس کی عمارت قائم کرنے کے لیے مسلم قومیت کا بنیادی نظریہ کہاں سے دستیاب ہوتا؟

یہ مدارس دینیہ کیا اسی لیے بے ضرورت ہیں اور ان پر قوم کی دولت اور وقت کا خرچ کرنا قومی سرمایہ کا ضیاع ہے کہ ان مدارس نے مسلم قومیت کا تحفظ کیا اور اس کو حکومتِ وقت کی پوری کوشش کے باوجود مٹنے نہیں دیا، جس کے نتیجے میں دنیائے اسلام کی سب سے بڑی سلطنت پاکستان، قومِ مسلم کو خداوند قدوس کی جانب سے عطا کی گئی ہے مگر ہم نے اس قدر نہیں کی اور اس میں اسلامی نظام جاری نہیں کیا جس کی وجہ سے اس کا ایک بہت بڑا حصہ علیحدہ ہو گیا اور باقی حصہ بھی خطرے میں ہے، جس قوم کو ان مدارس کی مساعی جمیلہ کی بدولت اتنی عظیم الشان حکومت حاصل ہوئی ہو اور جو مدارس حکومت کی بنیاد (مذہب) کے محافظ ہوں، کیا اسی قوم کا سرمایہ ان مدارس پر صرف کرنا بے فائدہ اور ضائع کرنا ہے؟

یاد رکھیے! جس طرح دینی مدارس سے مذہب اور اسلامی قومیت کی حفاظت ہوتی ہے اسی طرح ملک کی حفاظت اور اس کے استحکام کا دارومدار بھی انہی مدارس پر ہے اور جس طرح مطالبہ پاکستان کے لیے مسلم قومیت اور مذہب اسلام مستحکم اور مضبوط چٹان کی طرح ثابت ہوئے، جو ان سے ٹکرایا پاش پاش ہو گیا، اسی طرح آج بھی پاکستان کے بقا واستحکام کے لیے ان کو وہی حیثیت اور مقام حاصل ہے جس کا ستمبر ۶۵ء کی جنگ میں مشاہدہ بھی ہو چکا ہے اور اسلام اور مسلم قومیت کی بقا اور حفاظت کی ضامن چونکہ صرف یہی دینی تعلیم ہے جو مدارس دینیہ سے حاصل ہوتی ہے، اس لیے جتنی اہمیت اور ضرورت انگریزی دور میں دینی مدارس کے بقا اور قیام کی تھی اس سے بڑھ کر ان مدارس کی آج پاکستان میں ضرورت ہے، اس لیے کہ یہ مدارس جس طرح ملت اسلام اور دینی تعلیم کی حفاظت کے واسطے مضبوط قلعے ہیں اسی طرح ملک پاکستان کو بھی اغیار کے حملوں سے بچانے کے مضبوط و مستحکم اڈے ہیں۔ ان مدارس سے غفلت برتنا اور ان کے وجود کو ہی بے کار سمجھنا اور حسبِ استطاعت ان کی ترقی میں حصہ نہ لینا ملت اسلامیہ اور ملکِ پاکستان دونوں کی بنیاد سے بے پرواہی برتنے اور چشم پوشی کرنے کے مترادف ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ملتِ اسلام اور ملکِ پاکستان کے پاسبان ومحافظ، مدارسِ دینیہ کی امداد وحفاظت اور ان ساتھ تعاون کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وما علینا إلاّ البلاغ المبین وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العالمین

☆......☆......☆